ڈاکٹر فاخرہ اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین چونیاں

اقبالؔ کے ایک ہم عصر ـــــ امینِؔ حزیں

Ameen-e-Hazeen was one of the most devoted followers of Allama Iqbal in the first half of 20th Century. All his thoughts and ideas were just like Iqbal's. He was firmaly related with Quaomi, Milli and Islahi movements of that time. His poetry is full of hope, optimism, and enthusiasm. Now a days this type of poetry is as essential as it was at the time of freedom movement. Therefore we should take keen interest in poetry of Iqbal and his followers in this critical period.

ہے یہ اعجازِ نغمۂ اقبال　　　　اب عجم کو عجم نہیں کہتے

(امینِؔ حزیں)

بیسویں صدی کا نصف اول اُردو شاعری میں نئے اسالیب و موضوعات کی ترقی و ترویج کا ایک ایسا دور ہے کہ جس میں سرزمین پنجاب سے اٹھنے والی قومی، ملی اور اصلاحی تحریک ایک ادبی اور صحافتی یلغار کی صورت اختیار کر گئی حتیٰ کہ فرزندانِ قوم کے دل و دماغ میں اٹھنے والی ہیجانی کیفیات بھی جوش و جذبے کی حدود سے گزر کر مصمم ارادوں کی شکل میں ڈھلنے لگیں اور ازاں بعد برِعظیم کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اس دور میں پنجاب کی سرزمین پر اقبال کی حیثیت ایک آفتابِ عالمتاب کی سی ہے۔ان کے فکری و فنی اثرات اپنے وقت کے سیاسی، سماجی اور علمی و ادبی حلقوں اور ان سے منسلک شخصیات ہی کے لیے نہیں بلکہ آئندہ بہت سے ادوار اور ان کی عہد ساز شخصیات کے لیے بھی فیض رساں ثابت ہوئے۔

اقبال کے معاصرین میں قومی،ملی اور اصلاحی فکر و نظر کے حامل دیگر بہت سے رفقا میں خواجہ محمد مسیح پال (۱۸۸۴ء ـ ۱۹۶۸ء) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ـ مگر ''گلبانگِ حیات''، ''سرودِ سرمدی'' اور'' نوائے سروش'' جیسے تین بڑے دیدہ زیب اور خوش آہنگ مجموعہ ہائے کلام کے اس خالق کا کلام بھی دیگر بہت سے شعری مجموعوں کی طرح عدم توجہی کا شکار ہونے کے بعد طاق نسیاں ہو گیا۔ امینؔ حزیں کی شعری تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بے شمار پیش پا افتادہ مضامین کا رنگ اقبالؔ کے رنگِ سخن کے مماثل ہے۔ اقبالؔ اور امینِؔ حزیں میں جو قدریں مشترک تھیں ان میں اول یہ کہ دونوں کے خاندان کشمیر سے آ کر پنجاب میں آباد ہوئے، دوم یہ کہ دونوں کا آبائی شہر سیالکوٹ تھا، سوم یہ کہ دونوں نے شمس العلما سید میر حسن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور چہارم یہ کہ دونوں کے شعری مجموعوں (بانگِ درا اور گلبانگِ حیات) کا پیش لفظ شیخ سر عبدالقادر نے رقم کیا۔ اور شیخ عبدالقادر ''گلبانگِ حیات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب کو اپنے شاگردوں میں عربی، فارسی اور اُردو ادبیات کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں خاص مہارت تھی۔ وہ نہایت خاموشی سے علمی خدمات انجام دیتے تھے اور کبھی کسی اعزاز یا مفاد کے حکومت سے

طالب نہیں ہوئے۔ جب انھیں خطابِ شمس العلما ملا تو انھیں خود حیرت ہوئی کہ اس خطاب نے انھیں کیسے ڈھونڈ لیا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ خطاب سر اقبالؔ کی ایک اتفاقی گفتگو کا نتیجہ تھا۔ان دنوں کسی عالم یا مصنف کو خطاب دینے کا معاملہ زیرِ غور تھا۔ گورنر نے سر اقبال سے پوچھا کہ آپ کسی عالم کو جانتے ہیں جو اس امتیاز کے لیے موزوں ہو۔ سر اقبالؔ نے اپنے استاد کا نام لیا۔ گورنر نے دریافت کیا۔''ان کی تصانیف کون کون سی ہیں؟'' اقبالؔ نے جواب دیا ''ایک تو میں ہوں۔'' اس پر گورنر صاحب نے مسکرا کر کہا۔''یہ تصنیف تو خوب ہے۔''اقبالؔ نے کہا اس قسم کی کچھ اور بھی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ کتابیں بناتے ہیں مولوی صاحب کتابوں کے مصنف بناتے ہیں۔'' یہ جواب کارگر ہوا اور جو فہرستِ خطابات اس گفتگو کے بعد شائع ہوئی اس میں مولوی صاحب کا نام آفتابِ عالم تاب بن کر چمکا۔ مولوی میر حسن صاحب کی جو ''اس کی قسم کی کچھ اور'' تصانیف ہیں ان میں سے ایک جناب حزیں سیالکوٹی ہیں۔''[۱]

اقبالؔ نے اپنے کلام میں جس عزم، حوصلے اور ہمت کی بات کی ہے اس کا پرچار امینِ حزیں کے کلام میں بھی جا بجا ملتا ہے کیونکہ یہ جرات و جواں مردی اس دور خاص کا اہم تقاضا اور خاص ضرورت تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب برعظیم کے باشندوں کو سیاسی و سماجی محکومی کا طوق اپنی گردنوں میں چبھتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس دور میں جذبہ حریت سر اٹھانے لگا اور قفس سے رہائی حاصل کرنے کا احساس بھی تیز تر ہو گیا۔ اس احساس کی شدت اور ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اقبالؔ بھی فرطِ مسرت سے یہ کہنے لگے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　　　یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

بالآخر یہ سبھی راز داں اقبالؔ کے ہمنوا بن گئے ان سب ہمنواؤں نے مل کر جمہور کو بھی قوتِ پرواز کے راز سے آگاہ کر دیا۔ تاہم قویٰ کے مجتمع ہو جانے کے باعث قفس کی بندشیں ڈھیلی پڑنے لگیں اور آزادی سے ہمکنار ہونے کا آغاز ہو گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''دورِ اصلاح کے بعد بیسیوں صدی کا آغاز ہمہ گیر تبدیلیوں کے جلو میں ہوا۔ گزشتہ دور میں ملکی باشندوں کی حالت اس پر بریدہ طائر کی سی تھی جسے بے بس کر کے قفس میں ڈال دیا گیا ہو اور صیاد اسے پابندیِ آداب سکھا رہا ہو۔اصلاحی دور میں طائرِ قفس نے صیاد سے بھی بہت کچھ سیکھا اور زمانے کے استاد سے بھی، حتیٰ کہ اس کے پر و بال بھی از سرِ نو نکل آئے۔ البتہ درِ قفس ابھی بند پڑا تھا اور اس کے لیے سازگار حالات کے علاوہ جدوجہد کی بھی ضرورت تھی۔''[۲]

آزادی کی اس جنگ کو جیتنے کے لیے اقبالؔ نے اپنے ہم وطنوں میں جو ولولہ تازہ پیدا کرنے کی کوشش کی بلکہ خود کہا: اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو اس کی تقلید میں برعظیم کے دیگر بہت سے شعرا کے ساتھ امینِ حزیں بھی پوری طرح کوشاں و سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں جوش و جذبہ کا اظہار بارہا ملتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

مشکلیں سنگِ فساں ہیں تیغِ جراءت کے لیے　　　ٹھوکریں ہیں تازیانہ اسپِ ہمت کے لیے

وہ بھلا خاطر میں کیا لائیں تجھے چرخِ کبود — نردباں پستی ہے جن کی عرشِ رفعت کے لیے

(گلبانگِ حیات،ص ۸۶)

نگاہِ دیدۂ ادراک تیز تر کر لے — جو پیش آئیں مہمات ان کو سر کر لے
طلسمِ فطرتِ چالاک ٹوٹ جائے گا — ذرا سی غور سے اس پر اگر نظر کر لے

(نوائے سروش،ص ۲۷)

ناکامیوں سے زیر نہ ہونا ہے زندگی — جینے سے یعنی سیر نہ ہونا ہے زندگی
جینا مثالِ برق تڑپنے کا نام ہے — خاکِ لحد کا ڈھیر نہ ہونا ہے زندگی

(نوائے سروش،ص۳۲)

اے عقابی نگاہ کے مالک! — چھوڑ وادی کے آشیانے کو
سہل ہے سہل زیر کر لینا — اپنی پرواز سے زمانے کو

(نوائے سروش،ص۳۸)

خودی اور خود آگہی کا وہ احساسِ لطیف جو افرادِ قوم میں انفرادی اوراجتماعی خودی کی بیداری کا باعث بنتا ہے، اس کا اہتمامِ خاص امینؔ حزیں کے کلام کو پیرویِ اقبالؔ کا ضامن قرار دیتا ہے۔ اقبالؔ نے فرد کو خودی کا جوہر شناس بننے کے تلقین کی ہے کیونکہ یہ وہ نسخہ اکسیر ہے جو اقوام کے لیے طاقت اور سر بلندی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ معاصرینِ اقبالؔ میں جو لوگ جذبہء خودی کے مقلدین و مبلغین رہے ان میں امینؔ حزیں کا نام اس اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کہ انھوں نے جذبہ خودی کے فروغ اور ترویج کے لیے ایک موثر پیرایہ اظہار اختیار کیا ہے۔ بسا اوقات وہ سالارِ کارواں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اور خودی کا جوہرِ خاص میسر آجانے سے انسان کی چمک دمک میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کی ترجمانی امینؔ حزیں کے درج ذیل اشعار سے پوری طرح عیاں ہے:

”جو سوز ہے تیری رگ رگ میں کیا برق میں یا خورشید میں ہے؟
جو حسن ہے تیری فطرت میں کیا ماہ میں یا ناہید میں ہے؟
ہے تو ہی وہ مصحفِ یزدانی، یکتا ہے جو دہر کے مکتب میں
اوروں کی وہ تمت میں بھی نہیں جو شان تری تمہید میں ہے“

(نوائے سروش،ص ۲۰)

ذرۂ ناچیز تعمیرِ بیاباں تجھ سے ہے — تو بظاہر خاک ہے لیکن خیاباں تجھ سے ہے

اپنے نورِ سرمدی یعنی خودی میں ڈوب جا ماہ کا جلوہ ضیائے مہرِ تاباں تجھ سے ہے''

(گلبانگِ حیات، ص۴۲)

دریا کے تموج میں دریا کی خودی پنہاں گوہر کے تجمّل میں قطرے کی خودی نازاں

ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو مہر و مہ و انجم میں ہے اس کی خودی تاباں

(گلبانگِ حیات، ص۸۴)

ہے متاعِ بے بہا ذوقِ خودی زندگی کی شاں اسی جوہر سے ہے

ہر تب و تابِ حیات اس کے طفیل روشنی دراصل اسی اخگر میں ہے

(سرودِ سرمدی، ص ۶۷)

پختہ ہو جتنا امیں ذوقِ خودی اتنے ہی فکرونظر ہوں گے بلند

فرد اس کے فیض سے فردِ فرید امتیں ذوق خودی سے ارجمند

(سرودِ سرمدی، ص ۶۸)

خودی اور خودآگہی کا احساس وہ احساسِ بلند ہے جو ارتقائے زندگی کی جان ہے اقبالؔ جب یہ کہتے ہیں کہ:

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

تو دراصل وہ باشندگانِ برعظیم کو ایک ایسی کلیدِ کامیابی سے روشناس کراتے ہیں جو ہر دور میں یکساں قابلِ عمل اور قابلِ قدر قرار دی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اُردو شاعری'' میں لکھتے ہیں:

''اقبالؔ ہندوستان کی آزادی کے سچے خواہاں تھے اور سامراج دشمنی کا گہرا احساس رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب ملک میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا تو اقبالؔ نے بھی چند مضامین لکھے جن میں انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کی غلامی اور افلاس کا اصل سبب اس کی صنعتی پس ماندگی ہے۔ جب تک ہندوستان صنعتی طور پر ترقی نہیں کرتا، بیرونی تسلط سے نجات ممکن نہیں۔'' [۳]

اپنے اسی مضمون کے تحت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سردار جعفری کے ایک اقتباس کا حوالہ دیتے ہیں:

''شروع بیسویں صدی میں ہندوستان میں جو قومی آزادی کی لہر اونچی اٹھ رہی تھی اور ہندوستان کے بورژا طبقے میں جو خودشناسی اور خودنگری پیدا ہو رہی تھی۔ (اقبال کی شاعری میں) وہ فلسفہء خودی کی شکل میں ڈھلنے لگی۔ یہ انتہائی مہلک ہتھیاروں کے مسلح سامراج کے مقابلے میں ایک محکوم قوم کی ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی کی داخلی اور جذباتی طور سے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی کوشش ہے۔ یہ خودی معمولی چیز نہیں یہ کائنات کی روح و دل ہے۔ ساری دنیا اس کی ہے۔ اقبالؔ اس کے سامنے خدا کو بھی خاطر میں نہیں لاتے،

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ۔اقبالؔ نے اس خودی کو ''مردِ قلندر'' اور شاہین کا پیکرِ محسوس دیا ہے اور ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی کی ساری خصوصیات اس کے اندر بھر دی ہیں۔'' [۴]

یہاں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خودی کا ہونا اور نہ ہونا زندگی کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے بہت زیادہ متغیر کر سکتا ہے۔ زندہ قومیں اپنی خودی کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں اور اپنی خودی کے تحفظ و تقدم کے لیے ہر ممکن طریق سے کوشاں بھی رہتی ہیں۔ امینؔ حزیں اس کی بابت مزید یوں رطب اللساں ہیں:

خودی کی آنکھ نہ جھک جائے بزمِ ہستی میں　　　کہ جھک گئی تو یہ بے نور ہو کے رہتی ہے
جب اس کی ہوتی ہے فرعونیوں سے آویزش　　　خودی کلیم، خودی طور ہو کے رہتی ہے
خودی پہ جان چھڑکتے ہیں وہ جو جانتے ہیں　　　کہ دب گئی تو یہ مقہور ہو کے رہتی ہے

(گلبانگِ حیات، ص۷۳)

خفتہ ہے خودی جس کی ناقص ہے شعور اس کا　　　بے نطق کلیم اس کا بے شعلہ ہے طُور اس کا
آئی ہی نہیں جس کے لب پر یہ مئے باقی　　　بے کیف حیات اس کی بے لطف سرور اس کا

(گلبانگِ حیات، ص۸۴)

دلیلِ راہ چراغِ خودی اگر ہو جائے　　　قدم مسافرِ ہستی کا تیز تر ہو جائے
مقامِ عالیِ عرفانِ ذات ہے یعنی　　　خودی یہی ہے کہ تجھ کو تری خبر ہو جائے
تری نگاہ کو رفعت کا خوف ہے ورنہ　　　نہیں محال کہ تو زیر سے زبر ہو جائے

(گلبانگِ حیات، ص۳۳)

امینؔ حزیں کے کلام میں کچھ اشعار باعتبار ارتباطِ الفاظ و معانی اس درجہ اقبالؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر دل و دماغ بے ساختہ انھیں اقبالؔ ہی کا رنگ قرار دیتا ہے۔ یہاں اقبال اور امینؔ حزیں کے کلام کی کچھ گہری مماثلتیں ملاحظہ ہوں:

امینؔ حزیں کا ایک شعر ہے:

ہے طوفاں در بغل جس موجِ مضطر کا ہر اک قطرہ　　　اسے کیوں جستجو ہو راحتِ آغوشِ ساحل کی

اس شعر کو دیکھ کر اقبالؔ کا زیرِ نظر شعر یاد آتا ہے:

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں　　　وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

جوہر ذاتی کی چمک دمک کی اہمیت کی بابت جب اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ:

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے　　　ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جُو کا

امینؔ حزیں اقبالؔ کی پیروی میں یوں رقمطراز ہوئے ہیں:

بزم ہر رنگ ہے صاحب نظراں بزمِ شہود　　کھول کر دیدۂ دل دیکھیے نیرنگِ نمود
دخل ماحول کا بھی ہے کسی حد تک لیکن　　جوہرِ ذات ہے اکثر اثر اندازِ وجود

(گلبانگِ حیات، ص ۴۷)

اقبالؔ کا ایک خیال ہے:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو　　سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا کر

اسی خیال کو امینؔ حزیں کچھ اس طرح بیان کرتے ہی:

دیدۂ دل کا کھولنا سیکھو　　یعنی فطرت سے بولنا سیکھو
پر نشیمن میں بیٹھے کے نہیں　　ان کو گلشن میں تولنا سیکھو

(نوائے سروش، ص ۶۶)

امینؔ حزیں کا شعر:

جو غنچے شاخ سے رہے پیوستہ اے امیںؔ　　اک دن گلِ شگفتہ ہوئے اور ثمر ہوئے

بلاشبہ اقبالؔ کے مصرعہ ''پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ'' کا ترجمان ہے۔
اسی طرح امینؔ حزیں کا یہ شعر:

تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات　　بات یہ راز کی نہیں خود اپنا احترام کر

اقبالؔ کے درج ذیل شعر کی توضیح معلوم ہوتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

شا کی تقدیر بنتے ہوئے عمل سے فارغ ہو کر بیٹھ رہنے کے مضمون کو اقبالؔ یوں بیان کرتے ہیں:

خبر نہیں کیا ہے اس کا مطلب خدا فریبی کہ خود فریبی　　عمل سے فارغ ہوا مسلمان کر کے تقدیر کا بہانہ

امینؔ حزیں اس کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

جو ہر افتاد کو تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں　　خود اپنی خود فریبی کی وہی تشہیر کرتے ہیں
یہ جبر وقدر کے مارے ہوئے خوش فہم کیا جانیں　　ہمیں تخریب کرتے ہیں ہمیں تعمیر کرتے ہیں

(گلبانگِ حیات، ص ۶۸)

اقبالؔ جب یہ کہتے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تو اقبالؔ کے اس مضمون کی عکاسی امینؔ حزیں کے درج ذیل قطعے میں ہوتی ہے:

فلک کو کوستے ہیں نالہء شب گیر کرتے ہیں
جو پاداشِ عمل پر شکوۂ تقدیر کرتے ہیں

مکافاتِ عمل کا مسئلہ مشکل نہیں اتنا
یہ جنت ہو کہ دوزخ خود ہمیں تعمیر کرتے ہیں

(گلبانگِ حیات، ص ۶۸)

امینِؔ حزیں تدبیر کو تقدیر پر فوقیت دیتے ہوئے اسی موضوع کے تحت مزید یہ کہتے ہیں کہ:

جو کل ہونا ہے اس کی آج ہی تدبیر کرتے ہیں
کہ دوراندیش یوں تقدیر کی تعمیر کرتے ہیں

زبانِ فلسفہ میں ''حال'' کہتے ہیں امینؔ جس کو
ہم اپنی قسمتیں اس لوح پر تحریر کرتے ہیں

(گلبانگِ حیات، ص ۶۸)

امینِؔ حزیں اپنے زیرِ نظر قطعات میں بھی ذوقِ عمل کی تاکید کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں کہ زلفِ تقدیر کو بہر طور شانہء تدبیر سے سنوارا جاسکتا ہے۔

امروز اگر تیرا ہے آئینہء فردا
اے مردِ خدا! کیوں اسے صیقل نہیں کرتا

صیقل سے ابھر آئیں گے جو نقش ہیں دھندلے
کھنچ جائے گا بے ساختہ تقدیر کا نقشہ

(گلبانگِ حیات، ص۱۲۷)

جب موقلم ادارک کا فطرت سے ملا ہو
تخئیل کا صندوقچہ رنگوں سے بھرا ہو

جب فکرِ رسا میں نہ ہو خاکوں کی کمی کچھ
نقاش ہی خود کس لیے تصویر بنا ہو؟

(گلبانگِ حیات، ص۱۶۷)

تقدیر کے کوہِ گراں کو سر کرنے کے لیے تدبیر کے جس آلہ کار کی ضرورت درپیش ہوتی ہے وہ انسان کے جوہرِ ذاتی میں پوشیدہ ہے اور جوہرِ ذاتی کے موثر استعمال کے لیے مضبوط قوتِ ارادی درکار رہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس متزلزل ارادوں کا مالک کبھی اپنے جوہرِ ذاتی سے بھر پور فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ پروفیسر محمد منور اپنی تصنیف ''ایقانِ اقبال'' کے ایک مضمون بعنوان ''علامہ اقبالؔ کا تصورِ تقدیر'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا آسان کام نہیں، سوچا سمجھا فیصلہ وہی افراد کر سکتے ہیں جن کی ذات میں ''توحید'' موجود ہے۔ منتشر شخصیت کے مالک افراد ''کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے'' کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ فیصلہ ایک طرح کا اثباتِ خودی ہے اور حضرت علامہ کے الفاظ میں ''۔۔۔خودی کا اظہار اس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیاتِ نفسی کی وحدت کہتے ہیں۔'' ۔۔۔سقراط نے

کہا تھا ''Know thyself'' (عرفانِ ذات حاصل کرو)، یہ بھی کہا ''Choose thyself'' (انتخابِ ذات کرو)، جس کا مطلب ہے کہ تم کس حیثیت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، کون سی منزل مقرر کی ہے۔ حضرت علامہ اسی فیصلے کو انتخابِ تقدیر کہتے ہیں۔ کون سی تقدیر اختیار کرنا چاہتے ہو کا استفسار اس لیے جائز ہے کہ آدم میں تکوینِ ذات کا امکان موجود ہے۔ جہاں وہ یہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا ہے، وہاں وہ یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ اُسے کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کی تکوین لحظہ بہ لحظہ عمل میں آتی رہتی ہے کچھ حالتیں مر جاتی ہیں، کچھ حالتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کچھ شخصیت پیچھے رہ جاتی ہے کچھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ خود حضرت علامہ کے الفاظ ہیں ''ہماری تکوین کی ضرورت ہی یہ ہے کہ ہم وہ کچھ نہ رہیں جو ہیں۔ زندگی کا راستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے۔'' [۵]

امینؔ حزیں کے کلام میں ان کے دیگر معاصر شعرا کی طرح حکمت اور معرفت کی باتیں اکثر ''تجلیات''، ''معارف'' اور'' حقائق'' وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت بھی ملتی ہیں مگر اس کے باوصف ان کی مختلف عنوانات کی حامل نظمیں پیرویِ اقبال کا منہ بولتا ثبوت ہیں جن میں '' شعوروجدان''، ''ستارۂ صبح''، ''زندگی کا مقامِ محمود''، '' ترانہءِ مرغِ اسیر''، ''خودی خدائے خودی کے حضور''، '' قوانینِ حیات''، ''قوانینِ خودی''، '' حیرتِ دل''، ''نگاہِ شوق''، '' گل و خار''، '' گل و شاعر''، '' اقبال بارگاہِ باری تعالےٰ میں'' اور'' سرشتِ آدم خاکی خطا ہے'' وغیرہ جیسی نظمیں اقبالؔ کی نظموں کی طرح تمثیلی رنگ کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مکالماتی طرزِ بیان کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ نظمیں اپنے تمثیلی انداز میں مفاہیم و مطالب کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتی ہیں۔

دنیائے شعر و ادب میں اقبالؔ کے بعد بہت کم نام ایسے ہیں جن کا پورا کلام قومی، ملّی اور اصلاحی نقطہءِ نظر کا حامل ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ وہ احساسِ خاص ہے جو طبائع خاص ہی کو ودیعت ہوتا ہے اور پھر ان کی وساطت سے جمہور کو منتقل ہو جاتا ہے۔

امینؔ حزیں کے زیرِ نظر اشعار اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ شعور کے نور سے وجدان اور یقین کے مراحل طے کرنے والے دل ہی نگاہِ فطرت میں باریاب ہوتے ہیں۔ سجدوں کی تڑپ سے محروم جبیں دراصل جبیں کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ عمل سے بیزار بازو مارِ آستین سے کم نہیں ہوتے، نگاہ کا پنچھی اگر رنگ و بو کے دام میں الجھ کر رہ جائے تو پھر وہ پردہ دری، نکتہ رسی اور دور بینی کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ بقول امینؔ حزیں:

سجود کی جس جبیں میں پیہم تڑپ نہیں وہ جبیں نہیں ہے
عمل سے بیزار ہو جو بازو وہ اصل میں مارِ آستیں ہے
نگہ وہ کیا جو تڑپ کے رہ جائے دامِ دنیائے رنگ و بُو میں
نگہ وہی ہے جو پردہ در ہے جو نکتہ رس ہے جو دور بیں ہے

(گلبانگِ حیات، ص ۳۸)

امینؔ حزیں پیروی اقبالؔ میں فرزندان توحید کو ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے پُرعزم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نگاہِ پردہ در کی آرزو کر　　دلِ بالغ نظر کی آرزو کر
نگہ گنج آفریں ہے کیمیا ہے　　نہ گوہر کی نہ زر کی آررزو کر

(گلبانگِ حیات،ص ۴۰)

مسافر ہے سفر کی آرزو کر　　تو راہِ پرخطر کی آرزو کر
یہی شمشیرِ رزمِ زندگی ہے　　امیںؔ!دل کی جگر کی آرزو کر

(گلبانگِ حیات،ص ۴۰)

ارتقائے زیست کے مراحل طے کرنے کے لیے نگاہِ پردہ در اور دل بالغ نظر کا میسر آنا ضروری ہے۔ ازاں بعد نگہِ استغنا میں زروگوہر ہیچ اور بے وقعت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ امینؔ حزیں دل وجگر کو شمشیرِ رزمِ زندگی قرار دیتے ہیں کہ ان کے بغیر کارزارِ عمل میں سرخروئی ناممکن ہے۔

امینؔ حزیں اپنے وجود کو کیف وسرود کی سرمستی میں منسوبِ ساقی کرتے ہوئے مئے معرفت کے نشہء خاص کے تموج کا دم بھرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں رندِ میکدۂ ہست و بود ہوں ساقی!　　کہ بزمِ ناز میں تیری نمود ہوں ساقی!
خودی کا جام مجھے دے کے دے دیا کیا کچھ!　　ترے ہی جودوسخا کا وجود ہوں ساقی!
مرے پیالے میں دونوں جہاں ہیں عکس فگن　　میں اپنی ذات میں بزمِ شہود ہوں ساقی!

امینؔ حزیں اپنی ایک نظم بعنوان ”لا یُغیرّوالله بِقومِ حتّٰی یّغیرُوامَابِاَنفُسِھِم“ کے تحت لکھتے ہیں:

فطرتِ چالاک سے رہتی ہے اکثر گفتگو　　کس طرح بن کر بگڑ جاتی ہیں اقوام وملل؟
ایک ہی قانون ہے تعمیر اور تخریب کا　　اور اس کی دسترس میں ہیں سب اسباب وعلل
نام اس قانونِ قدرت کا ہے ”تغییرِ خودی“　　موت ملت کی خودی کی استواری میں خلل

(گلبانگِ حیات،ص ۱۰۹)

اقوام وملل کی تعمیر وتخریب میں دراصل ان کے اپنے ہی اعمال کارفرما ہوتے ہیں۔ اور انھیں اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کی سزائیں بہرطور بھگتنا پڑتی ہیں۔ یہی موضوع اقبالؔ کا بھی موضوعِ خاص ہے۔ فرماتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(اقبالؔ)

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے نہیں کرتی مگر اقوام کی غلطی کو معاف

(اقبالؔ)

اقبالؔ کے ایسے مقلدین کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے قومی، ملی اور اصلاحی سطح پر زوال پذیر اقدار کی طرف قارئینِ ادب کی توجہ مبذول کروانے کی سعی کی ہے۔ اور اس کا باعث تہذیبی انحطاط، ذہنی انتشار اور سیاسی خلفشار ہی ہو سکتا ہے کیونکہ وقت اور حالات جب ایسی صورت اختیار کرتے ہیں تو بہت سے اعلیٰ وارفع اخلاقی رویّوں کی پامالی کا عمل رونما ہونے لگتا ہے۔

اسی صورتِ حال کی نشاندہی ڈاکٹر تحسین فراقی کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوئی ہے۔

''یہ ایک طرفہ ماجرا ہے کہ اُردو ادب میں کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے اسلامی اقدار کا ایک نہایت قلیل حصہ منتقل ہوا ہے۔شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اُردو ادب نے اپنی ترقی کے مدارج ہمارے تہذیبی انحطاط کے زمانے میں طے کیے۔ چنانچہ انگریز کی حکمرانی کے زمانے میں ادب کا ایک حصہ صرف آفاق کے محدود دائرے میں گھومنے لگا اور انفس کی وسعتوں پر گرد جمنے لگی۔ اشپنگلز نے کہا کہ جب اقوام روحانی قوت اور اہم تہذیبی اقدار کی اشاعت کے فریضے سے بے نیاز ہو کر محض مادی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے وقف ہو جائیں تو ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور وہ داخلی امراض کا شکار ہو کر کمزور ہو جاتی ہیں اور ان کا کلچر بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ مسلمان اور اُردو ادب کے ساتھ بھی یہی المیہ پیش آیا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس پر ایک غیر ملکی بدیسی حکمران کا تسلط ہو گیا اور بقول ٹائن بی سیاسی غلامی ایک بہت بڑی لعنت ہے جس سے سلطنت کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔'' [۶]

یہاں اس زندہ حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اندھیرا جب شدید ہو جاتا ہے تو کوئی مردِ حق ضرور ایک روشن چراغ کا روپ دھار کر تاریک راستوں کو جگمگانے لگتا ہے۔ پھر اس کی لو سے مزید قندیلیں بھی جگمگا اٹھتی ہیں اور اس طرح اس دور کی تاریکی چھٹنے لگتی ہے۔ اقبالؔ تو اپنے دور کے وہ مہرِ عالمتاب ہیں جن کی ضیا آئندہ زمانوں کے لیے بھی ناگزیر ہو گئی اور اس سے چمک دمک حاصل کرنے والے ستارے بھی شبِ دیجور کو جھٹپٹے کا رنگ بخشنے پر قدرت رکھنے لگے۔ قومی، ملی اور اصلاحی سطح پر اقبالؔ کے افکار و نظریات کی روشنی آنے والے وقتوں کے ہر دور میں مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس سے مستفید ہونے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں سینیر تجزیہ نگار اور صحافی جناب متّو بھائی اپنے ایک کالم بعنوان: ''ہماری عمریں لمبی ہو رہی ہیں زندگیاں گھٹ رہی ہیں'' کے تحت لکھتے ہیں:

''بڑی شدت سے یہ احساس اجاگر ہو رہا ہے کہ ہم بہت تیز رفتاری سے قائداعظم محمد علی جناح کے علاوہ علامہ محمد اقبالؔ سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ فیض احمد فیضؔ نے ایک بار جنگ فورم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: ''جب تک ہم علامہ اقبالؔ کے قریب رہیں گے محفوظ رہیں گے۔ علامہ اقبالؔ سے دوری ہمیں غیر محفوظ کر دے گی اور کوئی بڑی سے بڑی فوج بھی ہماری حفاظت نہیں کر

سکے گی۔'' اس وقت مجھے یہ فیض صاحب کا بیان کچھ عجیب سا لگا تھا اور فیض صاحب کے ساتھ جن نظریات کو منسوب کیا جاتا تھا ان کی بھی تردید ہوتی تھی مگر آج لگتا ہے کہ فیض کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور علامہ اقبالؔ کے فرزند جاوید اقبال نے بھی اپنی یادداشتوں میں بھی یہی لکھا ہے پاکستان علامہ اقبالؔ اور قائداعظم سے بڑی تیزی سے لاتعلق ہوتا جا رہا ہے۔ خدا اس پاکستان کی حفاظت کرے جس کے بارے میں فیض صاحب نے یہی کہا تھا:

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں

یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں'' ۷

جب کوئی قوم اپنے قومی ہیروز کی نیک نامی سے آنکھیں چرانے لگے اور ایسے چھوٹے بڑے رابطوں سے کٹنے لگے جو اسے اپنی تہذیب اور اپنی شناخت سے جوڑتے ہیں تو پھر بحیثیت قوم اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ کسی بھی قوم کا اچھا یا برا ہونا اس کے زندہ افراد کے اقوال و افعال کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اور اس کی تاریخ خواہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کا حوالہ صرف ''پدرم سلطان بود'' تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے۔ بقول اقبالؔ:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی تاریخ اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے اگر کوئی عظمت یا عبرت کا سبق ہم لے سکتے ہیں تو وہ ہماری اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ پھر اس سبق کو عمل میں لاتے ہوئے کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا جس سے نہ صرف ہم بلکہ پوری نوع انسانی فیض یاب ہو سکے۔ گویا وہ سبق خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلائی پر مبنی ہو۔ کوئی بھی قوم اپنے افراد کے بہیمانہ اور انسانیت سوز رویوں کے باعث اقوامِ عالم میں سر اٹھا کے جینے کا حق کھو دیتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی گذشتہ تاریخ کے سنہری ابواب بھی قصہء پارینہ بن کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قوم اپنے ان محدود مگر مستند افراد کے افکار و نظریات کی طرف بار بار رجوع کرے جو اعلیٰ و ارفع اقدار کی پاسداری کا علم بلند کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ دراصل وہی لوگ انسانی روح کی اعلیٰ تربیت کے فن سے آشنا ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت تو سب پر عیاں ہے کہ انسان اگر کچھ متشدد رویوں کے غلبے کے تسلط سے خود کو بچا نہیں پاتا تو وہ جانور ہی نہیں جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا روح انسانی بہر کیف تربیت کی متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کا درج ذیل بیان قابلِ ملاحظہ ہے:

''انسانیت کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے: کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور ایسے عالمگیر نوعیت کے بنیادی اصول جو روحانی بنیادوں پر انسانی سماج کی نشوونما میں رہنما ہوں۔'' ۸

ذہنی، روحانی، جذباتی اور اخلاقی اعتبار سے تربیت یافتہ انسان جب اپنے جوہر ذاتی کو استعمال میں لانے کا ہنر جان لیتا ہے تو بلا شبہ عروج کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی بابت اقبالؔ یوں رطب اللسان ہوئے:

عروجِ آدمِ خاکی انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اسی مفہوم کی حامل امینؔ حزیں کی ایک نظم ''انسان'' کے درج ذیل اشعار بھی قابلِ غور ہیں:

فرشتے شوق سے لینے لگے ہیں نام ترا
اب ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں مقام ترا

تری نمود کی فطرت بھی ہوگئی قائل
تو ہی امام ہے کوئی نہیں امام ترا

غرورِ وسعت و پہنائیِ ''مکاں'' ٹوٹا
بچھا ہوا نہیں کیا ''لا مکاں'' میں دام ترا؟

شرابِ عشق ترستے ہیں جس کو آفاقی
اسی سرورِ مجسم سے پُر ر جام ترا

مجال کس کی ہے اتنی کہ تیرے منہ آئے
بلا سکوت۔ قیامت بکف کلام ترا

اسی مقام کو کہتے ہیں ''عبدہٗ'' کا مقام
خدائے پاک کا رتُو ما سوا غلام ترا

قسم ہے مجھ کو امینؔ حزیں کے وجداں کی
بنے گا بدر کبھی ماہِ ناتمام ترا

(گلبانگِ حیات،ص۱۲۴)

یہ بات سو فیصد درست ہے کہ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلانا اور وقتاً فوقتاً یہ احساس دلاتے رہنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ زندگی کے مختلف محاذوں پر لڑتے ہوئے معراجِ انسانیت کو بہر طور پیشِ نظر رکھے اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے کوشاں رہے جو اس کی احسن تقویم پر پیدا شدہ فطرت کا تقاضا ہیں۔اور عین ممکن ہے کہ یہی کارہائے نمایاں آئندہ نسلوں کے لیے مہمیز کا کام انجام دیں اور اس طرح نسل در نسل ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا یہ انسان بالآخر ہر زہر کا تریاق ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جائے۔مگر ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر اٹھنے والا قدم فلاح اور خیر ہی کی طرف اٹھے تاکہ ادب جو بیک وقت تفسیرِ حیات، تعمیرِ حیات اور تطہیر حیات کا دم بھرتا ہے، اپنے گرد و نواح میں بکھری ہوئی خیر اور فلاح کو عمل میں لاتے ہوئے بہت بلند پایا فن پاروں کی تخلیق کا ضامن بن جائے۔ گویا لکھنے والے کا قلم جو کچھ بھی لکھے وہ سچ ،صحیح اور خوش آئند ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''ادب اور قومی شعور'' میں لکھتے ہیں:

''یہ طے ہے کہ کوئی ادیب اور فنکار معاشرے کے ربط اور ذمے داری سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ ادیب در اصل اپنے معاشرے کے جذبات کا قدرے آزاد نمائندہ ترجمان ہوتا ہے۔ معاشرے کی نمائندگی اور افراد بھی کرتے ہیں مگر ادیب معاشرے کا حساس ترین نمائندہ ہوتا ہے جس کا قلب قومی زندگی کی نازک ترین جذباتی لہروں کو اوروں سے کئی زیادہ محسوس کرتا ہے، قدرت کی یہ عجوبہ مخلوق اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔ اسے ایک خاص قسم کی عصباتی ، اعصابی اور نفسیاتی شخصیت عطا کی جاتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات اس مخلوق کو ''ترقی یافتہ ءالہام'' یا جدید سوشیالوجی کی اصطلا ح میں Chrismatic مخلوق کہا جاتا ہے۔اور اس کی قومی ذمے داری بھی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔'' [9]

قومی ذمے داری سے عہدہ برا ہونے کا یہ عمل ''جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'' کی مصداق بے شمار مشکلات کو سر کرتے ہوئے ارتقاء کی طرف گامزن ہونے کا ہے کیونکہ ارتقاء کا عمل قدم قدم آگے بڑھتا ہے اور مسافتوں کی

طوالتیں اپنے اندر دشواریاں لیے ہوئے ہوتی ہیں۔مگر حصولِ منزل کی تڑپ جب تمام اضطرابیوں کے لیے چابک بن جاتی ہے تو منزل تک رسائی کے امکانات روشن ہونے لگتے ہیں۔امیؔنِ حزیں کی ایک غزل کے زیرِ نظر اشعار ان حقائق کا انکشاف کرتے ہیں:

بیتابیِ نگاہ سے اہل نظر ہوئے — مانندِ شمع سوز سے ہم خود نگر ہوئے
پرواز کی خلش کو نشیمن نہیں عزیز — دانے جنھیں نمو کا جنوں تھا شجر ہوئے
جو نونہال طالبِ بالیدگی رہے — پھولے وہی چمن میں وہی بارور ہوئے
کھولی صدف نے جن کے لیے تربیت کی گود — ابرِ بہار کے وہی قطرے گہر ہوئے
جو غنچے شاخ سے رہے پیوستہ اے امیؔں — اک دن گلِ شگفتہ ہوئے اور ثمر ہوئے

(گلبانگِ حیات،ص۵۲)

اصلاح پسندی کی رو میں بہہ کر اس دور کے دیگر شعرا کی طرح امیؔن حزیں نے بھی اپنے اشعار میں تنقید کی کاٹ اور سرزنش کے تازیانے سے کام لیا ہے۔کہتے ہیں:

بادۂ ناب سے پُر اس لیے پیمانہ نہیں — دست و بازو میں ترے جراتِ رندانہ نہیں
واعظِ شہر جو رندوں کو برا کہتے ہیں — آپ کی اپنی روش بھی تو بزرگانہ نہیں
نوجوانوں کو امیؔں دیکھ کے جی جلتا ہے — صورتیں کچھ بھی سہی سیرتیں مردانہ نہیں

(گلبانگِ حیات،ص۵۳)

جینے کی حقیقت سے ممکن نہیں آگاہی — جب تک نہ رگِ جاں میں تو حشر بپا کر لے
یا حرفِ غلط بن کر مٹ صفحۂ ہستی — یا زیرِ نگیں اپنے یہ ارض و سما کر لے

(نوائے سروش،ص ۴۸)

امیؔنِ حزیں پیرویِ اقباؔل میں عشق کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں بھی ہے حیات کا وجود کائنات میں — حیات عشق میں ہے اور عشق ہے حیات میں
اسی کے فیض سے یمِ حیات موج خیز ہے — اسی کے دم سے وسعتیں فضائے ممکنات میں

(نوائے سروش،ص۴۷)

سر شیخ عبدالقادر گلبانگِ حیات کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ امیؔن حزیں کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے نیاز فتح پوری نے انھیں کچھ یوں دادِ سخن دی ہے:

''اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کروں کے آپ کے ادبیات وقطعات بالکل جدید چیز ہیں، اور ان کی اشاعت از بس ضروری ہے۔بعض بعض مقامات پر آپ نے اس حسن کے ساتھ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے کہ ذوقِ سلیم وجد میں آجا تا ہے۔ آپ کے نظریہ سے میں بالکل متفق ہوں اور اس کی اشاعت کا موید۔''۱۰

یہاں یہ کہنا بجا ہے کہ امینؔ حزیں کا کلام اپنے عہد کی قومی، ملی اور اصلاحی تحریکوں کا علمبردار ہونے کی بنا پر بہت بامقصد اور قابلِ قدر قرار دیا جاسکتا ہے ایسا کلام زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ادیب ہی کے قلم کی پیداوار ہوسکتا ہے۔بقول امینؔ حزیں:

زندگی ہے امینؔ وہی ناکام　　　جوحقیقت سے آشنا نہ ہوئی

حوالہ جات

۱۔ سر شیخ عبدالقادر، پیش لفظ'' گلبانگِ حیات'' از امینؔ حزیں، الفیصل ناشران اُردو بازار لاہور، مئی ۲۰۰۶ء، ص (الف)

۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو شاعری سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۴

۳۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اُردو شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۷۹

۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اُردو شاعری، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸۰

۵۔ پروفیسر محمد منور، ایقانِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، طبعِ چہارم ۲۰۱۲ء، ص ۶۱، ۶۲

۶۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، جستجو، ندیم یونس پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰، ۲۱

۷۔ منو بھائی، کالم بعنوان: ''ہماری عمریں لمبی ہو رہی ہیں زندگیاں گھٹ رہی ہیں''، جنگ، ۷ فروری ۲۰۱۶ء، ص ۳

۸۔ علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر، تجدیدِ فکریاتِ اسلام (علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اُردو ترجمہ) از ڈاکٹر وحید عشرت، طبعِ سوم، ۲۰۱۱ء، ص ۹

۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ادب وفن، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، جون ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۲

۱۰۔ نیاز فتح پوری، پیش لفظ، ''گلبانگِ حیات''، الفیصل ناشرانِ کتب اُردو بازار لاہور مئی ۲۰۰۶ء، ص (ج)

۱۱۔ امینؔ حزیں، گلبانگِ حیات، الفیصل ناشرانِ کتب اُردو بازار لاہور، مئی ۲۰۰۶ء

۱۲۔ امینؔ حزیں، نوائے سروش، الفیصل ناشرانِ کتب اُردو بازار لاہور، اگست ۲۰۰۶ء

۱۳۔ امینؔ حزیں، سرودِ سرمدی، الفیصل ناشرانِ کتب اُردو بازار لاہور، جولائی ۲۰۰۶ء